

ضرورت ہی محسوس نہ کی، مایا ہوسکتا ہے کہ صحرائی خطہ ہونے کی وجہ سے  
نہر کا خیال ہی دل سے نکال دیا ہو۔

ایک ن عجیب و غریب اقدام پیش آیا۔ موسم گرما کا وسط تھا۔ سب لوگ  
اپنے اپنے جھونپڑوں میں آرام کی خاطر لیٹے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت سے  
گاؤں جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ گاؤں کا مذہبی پیشوا پنڈت ہرنس کچھ زیادہ  
ہی پریشان تھا جب گرمی کی شدت برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ اپنے  
جھونپڑے سے نکلا اور کنوئیں کی طرف چل دیا۔ اس نے سوچا کہ غسل کرنے  
سے طبیعت کو ضرور سکون حاصل ہو جائے گا۔ راستے بھڑاس کے پاؤں  
خاک کی جھونپڑ سے جھلستے رہے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا  
اور جلد از جلد کنوئیں پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کنوئیں پر ہونکا عالم طاری تھا۔  
ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اُسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔  
وہ ٹھٹھک کر رہ گیا، چاروں طرف دیکھا لیکن بچہ نظر نہ آیا۔ اُس پر سکتہ سا  
طاری ہو گیا۔ اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ بچے کی آواز ایک مرتبہ  
پھر سنائی دی یقیناً یہ آواز کنوئیں کے پیچھے سے آرہی تھی لیکن اس سخت  
گرمی میں دوپہر کے وقت یہ بچہ آخر آیا کہاں سے؟ وہ تیراں پریشان

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں فاتحین کی صف  
میں سمد رگپت کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب کے مورخین اُسے  
ہندوستان کا پولین کہتے ہیں۔ اس کی فتوحات سے ایک بات کا صاف پتا  
چلتا ہے کہ اُس کا مقصد ایک کل ہند سلطنت قائم کرنا تھا جس کے لئے  
اُس نے خبریہ بھرتی کے احکام بھی نافذ کر رکھے تھے۔ ان سب باتوں کے  
بادجہ اُس کا ہندوستان گیر فتوحات کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔  
بریکانیر کا علاقہ سمد رگپت کا باجگزار تھا اور یہ اپنی خشک سال  
کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ لوگ اپنے استعمال  
کیلئے دو کنوؤں سے پانی حاصل کرتے تھے۔ ایک کنواں علی ذات کے لئے  
تھا اور دوسرا دونی ذات والوں کے لئے۔ ان کنوؤں سے بہت سی استانیں  
وابستہ ہو گئی تھیں اور یہ کنوئیں نہ صرف گاؤں والوں کی پیاس بجھاتے تھے  
بلکہ دوؤں کی دھڑکن اور ملن کا باعث بھی بنتے تھے۔ کنوئیں جس عشق کے  
سنگم تھے اور دو بچھڑے ہوئے دلوں کی محبت کے امین تھے۔

یہاں کے لوگ نومذہب، جفاکش اور بہت معنسی تھے۔ اگر وہ چاہتے تو  
اپنے لئے ایک نہر کھود سکتے تھے۔ لیکن جانے کیوں انہوں نے کبھی اسکی





ابھی کھڑا یہ سونچ ہی رہا تھا کہ واپس جانے یا آگے بڑھ کر غسل کرے  
کمنچے کے رونے کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ حوصلہ کر کے کنوئیں کے پیچھے چلا  
گیا۔ وہاں سفید کپڑے میں لپٹا ہوا ایک بچہ پڑا تھا وہ جھکا اور اُسے اٹھایا۔  
بچہ صحت مند تھا، شاید دو تین دن کا رہا ہو گا۔

وہ غسل کرنا بھول گیا، کمنچے کو لیکر فزا گاؤں واپس آیا پورے  
گاؤں میں خبر آگ کی طرح پھیل گئی، ہر شخص ایک دوسرے کو شک و شبہ  
کی نظر سے دیکھ رہا تھا عورتیں ایک دوسرے پر الزام تراشنے لگیں۔ لیکن  
نومو لو د بچے کا وارث پیدا نہ ہو سکا۔

بچے کو مندر کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اُس کا نام سمیر رکھا گیا سب  
گاؤں والے اُس کی پرورش میں جوش و خروش سے حصہ لینے لگے۔ بچہ بھی  
تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔ لیکن گاؤں والے اپنے بچوں کو سمیر سے دُور  
دُور ہی رکھتے تھے جیسے وہ کوئی گھناؤنی چیز ہو۔ گاؤں میں اُس کے متعلق  
یہ مختصر اور بے ہودہ سی بات عام تھی کہ سمیر کے باپ کا کچھ بتا نہیں۔  
سمیر اب جوانی کی حدود کو چھو رہا تھا۔ وہ بڑا صحت مند اور سمیلا  
جوان نکلتا تھا۔ اُس کا کوئی دوست تھا نہ رشتہ دار۔ لے دے کے ایک پنڈت  
ہر بے تھے مگر وہ بھی ہر وقت نپوندھناج میں مصروف رہتے تھے جس سے  
سمیر کو بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔ لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ کہیں جا بھی تو نہیں سکتا  
تھا۔ شام ڈھلے جب کبھی وہ گھومنے پھرنے کیلئے نکلتا تو گاؤں کی بڑیاں  
اُسے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں لیکن جب وہ سامنے آجاتا تو منہ  
پھیر لیتیں یا کھڑکی بند کر لیتیں جیسے انہیں سمیر کے بدن سے ولدیت نامعلوم  
کی بُرائی ہو۔ اُسے بھی اس چیز کا شدت سے احساس ہوتا تھا لیکن اس نے  
کبھی اپنی اس شدت کا رویہ سے اظہار نہیں ہونے دیا۔

اب وہ جوان تھا۔ مندر کی زندگی سے وہ پہلے ہی عاجز آچکا تھا۔  
اُسے زندہ رہنے کیلئے مزدوری کی تلاش تھی کیونکہ اُسے کوئی کام بھی نہ آتا  
تھا۔ تنگ آکر وہ اکثر گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کرتا لیکن بہت نہ پڑتی۔

ایک دن اُنکھیں بند کئے روزگار کے خیال میں ڈوبا کچھ سوچ رہا  
تھا کہ اُس نے اپنے کندھوں پر کسی کا ایک ہاتھ رکھا ہوا محسوس کیا۔ اس  
نے اُنکھیں کھولیں تو ایک ضعیف آدمی کو اپنے سامنے پایا۔ یہ ہندو تھا  
جس کا گاؤں میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا کارخانہ تھا اور اس کی ضعیفی کی  
وجہ سے آجکل خرابے میں جا رہا تھا۔ اُسے اپنے کام کے لئے ایک ایسے  
شخص کی تلاش تھی جو اس کا ہاتھ بنا سکے۔ اور اس کام کیلئے اُس کی نظریں

کچھ عرصے سے سمیر پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے سمیر کو اپنے ساتھ کام کر نیکی  
دعوت دی جسے سمیر نے بلاپس واپس قبول کر لیا۔

سمیر دل لگا کے کام کرنے لگا اور کچھ ہی دنوں میں وہ اچھا خاصا  
کام سیکھ گیا۔ سمیر کی سخت محنت و کوشش سے ہندو کا کارخانہ دوبارہ اچھی طرح  
چلنے لگا۔ اب وہ نہ صرف بہت خوش تھا بلکہ ایک طرح سے آزادی بھی محسوس  
کر رہا تھا ہندو کو اب کارخانے کی اتنی تنگدستی تھی۔ اس لئے اکثر وہ بیتر باہر  
بھی رہنے لگا۔ کارخانے سے بلا ہوا ہندو کا جھوپڑا تھا جس میں وہ اپنی  
اکھوتی اور جوان بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کلدیپ کا سمیر سے پرہیز نہ تھا لیکن  
باپ کی سخت تاکید کی وجہ سے وہ اس کے سامنے بھی نہ آتی تھی سمیر کو بھی  
اُس کی موجودگی کا شدت سے احساس رہتا لیکن اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ  
اکثر اُس کے تصور میں ڈوبا رہتا پھر اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کلدیپ  
سے محبت کرنے لگا ہو۔ کلدیپ جو اُس کی خیالی محبوبہ کے مانند تھی ہر وقت  
اُس کے اعصاب پر سوار رہتی۔ وہ اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ کسی کام کا نہ رہا۔  
کبھی کبھی کام چھوڑ کر اچانک باہر آجاتا اور اُس کے جھوپڑے کی طرف ٹھٹکی  
باندھے دیکھتا رہتا لیکن گھنٹوں کی ٹھٹکی کے بعد بھی کلدیپ نظر نہ آتا ہاں وہ  
بوڑھا بار بار دکھائی دیتا جو اس کا مالک بھی تھا، جو بی بی بوڑھے کی جھلک کھاتی  
دیتی وہ کارخانے میں بھاگ جاتا۔

ایک دن جب ہندو کنوئیں پر پانی بھرنے گیا تو سمیر جنت کر کے اُس  
کے جھوپڑے میں داخل ہو گیا۔ کلدیپ کا حسین چہرہ گرمی کی وجہ سے تھرا رہا  
تھا۔ اُس کی خم کھاتی ہوئی زلفیں سینے پر لٹک رہی تھیں۔ سینہ ماری کے  
پتے سے بے نیاز تھا۔ وہ سمیر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ سمیر  
اُسے بڑھا اور کلدیپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں اس اجنبی لذت سے واقف تھے۔ سامنے جسم  
میں ایک عجیب سی سنسناہٹ روڑنے لگی۔ کلدیپ ایک عجیب سا نشہ  
محسوس کر رہی تھی۔ اس کے اندر ہاتھ چھڑانے کی جہت نہ تھی۔ اُدھر سمیر کے پاس  
بھی اتنا وقت نہ تھا کہ اُس سے راز و نیاز کی باتیں کر سکتا۔ وہ بہت کچھ کہنا  
چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"مجھے تم سے محبت ہے کلدیپ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں مجھے نفرت  
ہو لیکن کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ دن میں ایک بار تمہی جھلک دیکھ سکوں  
اُس نے پریشانی تمام یہ الفاظ ادا کئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دے اُس  
نے کلدیپ کا ہاتھ پاس و حسرت سے دبا لیا اور واپس چلا آیا۔

کلدیپ گم گم کھڑی رہی گھبراہٹ میں وہ کوئی جواب بھی نہ دے



چاہتے!

”افسوس! میں اتنی جرات نہیں کر سکتا، تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں کنوئیں کے آس پاس پڑا ہوا ملا تھا۔ میرا تو کوئی خاندان ہے نہ کوئی عزیز رشتے دار۔ اس دنیا میں سوائے اپنے بازوؤں کے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا باپ مجھ غریب اور ولدیت نامعلوم سے تمہاری شادی کیوں کر لے لگا؟“

کلید پنے اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سخت رنج کا اظہار کیا۔ اُس کے بالوں میں اپنی خرد طبی انگلیوں کو پھیرتے ہوئے کہنے لگی، ”ان باتوں میں کیا رکھا ہے سمیر! میں تو بس تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے قبول کر لو۔“

سمیر نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اُس کی زلفوں کو بوسہ دیا اور دیر تک تسلی دلا سادیا رہا۔

گاؤں والے یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے۔ وہ سمیر کے وجود سے ہی نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو اکٹھے چہل قدمی کرتے دیکھ لیا تھا اور کچھ لوگوں نے تو کچھ ناقابل بیان مناظر بھی دیکھ لئے تھے رات گئے جب ہندو گھر واپس پہنچا تو گاؤں والوں نے ان دونوں کے ہنگاموں

سکی۔ لیکن اپنے دل میں سمیر کی محبت فرد محسوس کرنے لگی تھی۔ اب جب کبھی وہ باہر جاتی تو اُسے کن آنکھیں سے دیکھنے کی کوشش ضرور کرتی۔ اسے سمیر کی حالت پر بہت دکھ ہوتا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمیر کی دسوزی خاموش التجاؤں اور محبت کی شعلہ بار آنکھوں سے وہ متاثر ہونے لگی اور آخر سمیر کی محبت کی ریاضت نگ لائی۔ اب وہ مسلسل مضطرب رہنے لگی تھی وہ اس کے خوابوں میں آنے لگا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ اس سے مل نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کا باپ اس کی سخت نگرانی کرتا تھا۔

کافی عرصے کے بعد انہیں ملنے کا ایک موقع پھر ملا۔ کلید کا باپ لکڑی کی خریداری کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔ دونوں دارفغان محبت نے پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ان بھولی بھولی باتوں کو دہرایا جو وہ اب تک سوچتے رہتے تھے۔ گفتگو کے دوران کبھی کبھی بے ساختہ بھولے ہوئے گیت بھی اُن کی زبان پر آجاتے تھے۔ کبھی وہ خاموش ہو جاتے کیونکہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا باتیں کریں۔ آخر کار وہ ایک جگہ پہنچ کر رُک گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سرشار نظروں سے دیکھا لیکن کلید پنے اُس کی نظروں کو برداشت نہ کر سکی وہ بولی:

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ کیا تم مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھنا

## نئی دریافت جس کے ذریعہ بلا آپریشن بواسیر کے متے سکڑتے اور غائب ہو جاتے ہیں خارش سے چھٹکارہ۔ درد سے منتوں میں نجات

مرم کی شکل میں دستیاب ہے۔ اور اسپرٹی پریپریشن ایچ کے نام سے مشہور ہے۔ اسپرٹی پریپریشن ایچ، نہ صرف مستوں کو سکڑتی ہی ہے بلکہ بلا تکلیف اجابت میں بھی مدد دیتی ہے۔ یہ ذوا جراثیم کو پیدا ہونے سے روکتی ہے جو بواسیر کی جڑ ہے۔ صرن اسپرٹی پریپریشن ایچ، ہی میں یہ حیرت انگیز مرکب موجود ہے۔ جو جلد ہی زخمی نسوں کو مندمل کر کے ان کو اپنی اصلی حالت پر لے آتا ہے اور صحت مند نسوں کی نشوونما میں مدد دیتا ہے۔ آپ بھی اسپرٹی پریپریشن ایچ، طلب فرمائیں جو ہرگز زخمی ذوا فروشد کے یہاں دستیاب ہے۔

نیویارک۔ این۔ وائی۔ اسپیشل، ایک مشہور عالم آوارہ نے بواسیر کی ایک ایسی تیر بہدت دوا دریافت کر لی ہے جس کی حیرت انگیز خصوصیات بلا آپریشن بواسیر کے مستوں کو سکڑ کر غائب کر دینا ہے۔ اس دوا کے استعمال کے چند ہی منٹ میں مریض درد، خارش اور سوزش سے ایک ناقابل یقین سا آفاقہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ دوا زخمی نسوں کو مندمل کر کے تکلیف وہ سوجن کو ختم کر دیتی ہے۔ ڈاکٹروں کے زیر نگرانی دس دس اور بیس بیس سال کے پرانے مریضوں پر اس دوا کے تجربات نے اس کی کامیابی کو ثابت کر دیا۔ اس حیرت انگیز آفاقہ کارا زوہ مرکب ہے جو



سے اُگاہ کیا۔ باپ کو شک تو پہلے ہی سے تھا۔ اب یقین آگیا اور اُس نے اپنی بیٹی پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔

لیکن مہندہ اس بات کو محسوس کئے بغیر زورہ سکا کہ کلدیپ صبح سے شام تک خوشی سے گاتی پھرتی ہے اور یا پھر سینے پر ہونے کے کام کے بجائے جھونپڑی میں کھرکی کے قریب سمیر کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بیٹھی رہتی ہے۔ باپ نے بیچاری کلدیپ کو ایک پرند کی طرح بند کر دیا تھا۔ ادھر کارخانے کا چھوٹا دروازہ جو جھونپڑے میں کھلتا تھا بند کر دیا گیا۔ لیکن کلدیپ کو ان میں سے کسی بات کی بھی پروا نہ تھی۔ وہ چوری سے صحن کے دروازے کو کھول کر بھاگنے کی کوشش کرتی تو اُس کا باپ اسے اس طرح مارتا جیسے وہ نافرمان جانور ہو۔ وہ اُسے بہت مارتا باپ کے سامنے دار ہاتھ پر دکتے دکتے بے دم ہو کر فرش پر گر پڑتی۔ اُس کے بدن پر نیل پڑ جاتے۔ اب وہ بظاہر اپنے باپ کی اطاعت کی نافرمانی کرتی لیکن اس کا پورا وجود باپ کے خلاف جذبہ بغاوت سے لبریز تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو ملا کر نفرت و حقارت سے اپنے باپ کو بددعائیں دیتی جو اُس کی محبت میں حائل ہو جاتھا۔ اسی دوران سمدگپت کو اپنی نئی فتوحات کیلئے کثیر تعداد میں فوجیوں کی ضرورت پیش آگئی۔ ہر طرف سے جبریہ بھرتی شروع ہو گئی۔ گاؤں والوں کیلئے یہ سنہری موقع تھا۔ وہ سمیر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے انہوں نے گاؤں والوں کی طرف سے سمیر کو بھرتی کر دیا۔ مجبوراً اُسے فوج میں جانا پڑا۔ کلدیپ کو جب یہ پتا چلا کہ اُس کا محبوب محاذ پر جا رہا ہے تو وہ ممکن ہو گئی۔ اُس کی تو کوئی بہیلی بھی نہ تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات کہتی۔ وہ اس خیال سے اور زیادہ اُداس تھی کہ اب وہ دونوں الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکیں گے۔

اُدھر سمیر کی حالت بھی غیر تھی اُس کی رات کروڑوں میں گزرتی۔ وہ پریشان تھا کہ کس طرح کلدیپ کے ملاقات ہو۔ اُس سے بے بغیر تو وہ محاذ پر لڑ بھی نہ سکے گا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ کل اُس سے ضرور ملیگا۔ دوسرے دن علی الصبح وہ کلدیپ کے جھونپڑے کی طرف گیا۔ لیکن وہاں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ناکام و نامراد واپس آگیا۔ کچھ دیر انتظار کیا اسے یہاں کا ایک ایک لمحہ ایک لمحہ کی بار بار معلوم ہوتا تھا۔ یہ گھڑیاں اُس کیلئے پہاڑ بن گئی تھیں۔ وہ دوبارہ جانے کیلئے اٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ کلدیپ کا باپ ہندو صحن میں بیٹھا ایک پیسے کی مرمت کر رہا ہے وہ تھکا چکر کاٹ کر جھونپڑے کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہیں آواز میں کلدیپ کو

پکارا۔ کلدیپ تو جیسے اس آواز کی منتظر ہی بیٹھی تھی۔ ایک نظر اُس نے اپنے باپ کو صحن میں کام کرتے دیکھا اور فوراً آواز کی طرف پسی۔

”آج رات اپنی ملاقات کی پرانی جگہ پر میں تمہارا انتظار کروں گا یہ ہماری ملاقات کا غالباً آخری موقع ہے۔ اگر تم نہ آئیں تو میں وہیں پھنسا ڈال کر کسی درخت سے لٹک جاؤں گا۔ سمیر نے نہایت تکلیف دہ آواز میں کہا۔

”میں ضرور آؤں گی سمیر! بھگوان کی سونگہ کھا کر کہتی ہوں میں اس سے وہاں بلوں گی۔ اگر وہاں آنے کیلئے مجھے اپنی جان پر بھی کھیلنا پڑتا ہے آؤں گی۔“ اُس نے گھبرا کر جواب دیا۔



گاؤں میں بھگدڑ مچ رہی تھی۔ افراتفری کا عالم تھا۔ جنگ کا سامان تھا۔ گاؤں روشنی سے جگمگا اٹھتا تھا۔ ہر شخص پانی پانی پکا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں بالیاں تھیں اور کسی کے ہاتھوں میں ڈول۔ لیکن کونویرنگ پہنچنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ چٹا چٹا کی آوازیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ بالنس چرچ رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب دھیرہ ماس ہے ہوں بھڑکے اور گائیں خوف سے میدان میں بھاگتی پھر رہی تھیں۔ کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ پورا گاؤں بدتماس اور پریشان تھا۔

لیکن ان سب کے دور، دنیا سے بے نیاز، کلدیپ خوشیوں سے سرشار اپنے محبوب کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سمیر کا ہاتھ تھا۔ دونوں مسرور تھے۔ دونوں گاؤں والوں کی چیخ و پکار سن رہے تھے۔ کلدیپ نرم اور مٹلی آواز میں اُس سے کہہ رہی تھی:

”دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ میرے یہاں آنے سے لوگوں کو بہت بڑے نقصان اور مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے تم عزیز ہو۔ مجھے تمہاری محبت چاہئے۔ مجھے صرف تمہاری محبت درکار ہے۔“

اور پھر گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وحشیانہ تہجد لگا کر بولی۔ ”سمیر! جب تم میدان جنگ کے جیت کر واپس آؤ گے تو ہماری شادی کے اجتماع کے موقع پر بھی راتا چراغاں نہیں ہوگا۔“

”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“ سمیر نے پوچھا۔

”میں نے اپنے جھونپڑے اور کارخانے میں آگ لگا دی تھی۔“



وہ خوشی سے بولی۔